

”آثار الصنادید“ کی تفہیم جدید

A Modern Understanding of *Asar-us-Sanadeed*

By Dr. Muhammad Furqan Sumbhali, Assistant Professor,
Department of Urdu, Women's College, Aligarh Muslim University,
Aligarh, India.

ABSTRACT

Asar-us-Sanadeed is a book published by Sir Siyed about the ancient monuments of Delhi from the medieval era. Sir Siyed was an eminent personality of the 19th century who delved in a long list of intellectual pursuits during his lifetime. These works of his have continued to be looked at and analyzed using different prisms long after his passing. It can be said that the events of 1857 brought a major change in Sir Syed's thinking and his world view which, in turn, led to him becoming one of the major voices of 19th century. *Asar-us-Sanadeed* is an example of the intellectual and literary capabilities of man and can be used to understand his appreciation of history and archaeology as well as its implication for the present and the future. However, it is saddening that the book is still surrounded by a mist of uncertainty and controversy. Through the book is a major archaeological account that cannot be ignored, questions around it have lingered and have never been quite fully tackled and answered. These include concerns around when and how the book was published, who is the actual writer of the book, is it the first book of its kind, what were the reasons behind the conceptions of the book, and who was the intended audience for it etc. These are the major themes that this article attempts to explore. Research brings us to the conclusion that the book was indeed written by Sir Syed with Imran Baksh Sehbai providing help and support. Sir Syed did not seem to have major monetary considerations in mind while attempting the book but was simply aiming to grab the attention of the Britishers. The book was also aimed to serve as a guide for the various visitors who

اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، خواتین کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ہندوستان۔

came to Dehli and were interested in monuments of a bygone era. *Asar-us-Sanadeed* can be said to be the first book of its kind in Urdu language, through books tackling a subject of such nature had been published in English and Persian etc. Before 1847 as well. Allegation that Sir Syed plagiarized these works without giving due credit turn out to be unfounded. In conclusion, *Asar-us-Sanadeed* can be said to have opened new avenues for research and exploration around archaeology as well as having brought Sir Syed to national prominence as an author, a cultured scholar and an intellectual.

Keywords: Sir Syed Ahmed Khan, *Asar-us-Sanadeed*, *Siyar-ul-Manazil*, Archaeology, Imam Bakhsh Sehba, Qutub Minar, Fort, Delhi, controversy, Intellectual, Culture.

سرسید احمد خاں بیسویں صدی کی عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ہمہ جہت علمی و عملی کارناموں کی دریافت کی کوششیں گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں کسی نہ کسی شکل میں ہوتی رہی ہیں۔ گزشتہ دو تین برسوں میں جتنے علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی کام سامنے آئے ہیں اپنی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے وہ بہت قابل قدر اور حوصلہ افزا ہیں۔ نئی تحقیق و تنقید اور تصنیف و تالیف کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں ان کا خاص مقام ہے۔ سرسید کے علمی و تحقیقی اور تصنیفی کارناموں کا آغاز ۱۸۳۳ء میں ہو گیا تھا۔ ’سید الاخبار‘ اور اس دور تک کی تالیفات سے ان کی قانون و صحافت سے دل چسپی بھی سامنے آنے لگی تھی لیکن ۱۸۴۷ء میں ’آثار الصنادید‘ کی اشاعت ان کی علمی شخصیت کی بلندی، عظمت کی دلیل اور شہرت کی ضامن ثابت ہوئی۔ یہ سرسید کی ایسی کاوش تھی جس نے بہ تدریج ان کا غلغلہ بلند کیا۔ اس کتاب کی دوسری اشاعت ۱۸۵۴ء نے اردو زبان کی خدمت ہی نہیں بلکہ غیر منقسم ہندوستان کے سنہری ماضی کو بھی محفوظ کر دیا۔ ’آثار الصنادید‘ ایک ایسی کتاب ہے جس کے تحقیق و تلاش کا مطلع ابھی تک صاف نہیں ہے۔ ہمارا مٹح نظر سرسید کی اس اہم اور بنیادی علمی و تحقیقی تالیف ’آثار الصنادید‘ کے تعلق سے اسی گوشے پر گفتگو کرنا ہے۔

یہ کتاب دہلی کی تاریخی عمارات، آثار، کتبات اور شخصیات کا ایک جامع تذکرہ، تاریخ اور قاموسی تالیف ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ماہرین سرسیدیات نے ’آثار الصنادید‘ کے تعلق سے مستند اور معتبر تحقیقی مقالات تحریر کئے ہیں جن میں ڈیوڈ لیلی ویلڈ ہی ایم نعیم، فاطمہ قریشی وغیرہ جیسے کئی اہم نام شامل ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے تاہم اپنی مقبولیت کے ۷۰ سالہ سفر کے دوران اس کتاب پر بوجہ بعض اعتراضات کیے گئے اور متعدد اشکالات اور سوالات بھی قائم ہوئے۔

مثلاً:

۱۔ ’آثار الصنادید‘ کے اصل مصنف سرسید ہیں یا اس کی تصنیف و تالیف کسی اور کی مرہون منت ہے؟

۲۔ آثارالصنادید کی اشاعت کب اور کس طرح ہوئی؟

۳۔ کیا یہ آثار قدیمہ پر لکھی گئی پہلی کتاب کہی جاسکتی ہے؟

۴۔ اس کتاب کو تحریر کرنے کے مقاصد کیا تھے؟

۵۔ کتاب کے اصل نام کیا ہیں؟

۶۔ یہ کتاب کس طبقے کو سامنے رکھ کر قلم بند کی گئی؟ وغیرہ وغیرہ۔

’دہلؤ نام کے ایک راجا کے نام پر وجود میں آئے شہر دہلی (دلی) سے عام ہندوستانیوں کو ہی نہیں بلکہ یونانی فلسفیوں، غزنویوں، خلیجیوں، مغلوں اور انگریزوں کو بھی گہری دل چسپی رہی ہے۔ ماہرین جغرافیہ کے مطابق دہلی 37°N اور 77°E پر واقع ہے۔ سرسید احمد خاں اسی دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھیں دہلی اور اس کی گلیوں سے عشق تھا اور وہ خود کو ’دہلی والا‘ کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کی تباہ کاریوں کے باوجود دہلی کی شان و شوکت کے قصیدے ہمیشہ پڑھے جاتے رہے ہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کی دہلی سے محبت کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے کہا تھا:

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن

کون جائے ذوق پردلی کی گلیاں چھوڑ کر

دہلی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ہر دور میں یہاں علوم و فنون کے ماہرین موجود رہے ہیں۔ میر تقی میر نے لکھا ہے:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

غرض دہلی کی قدرتی اور جغرافیائی خصوصیات اور آثار و تاریخی عمارات نے دنیا بھر کے اہل فکر و نظر، سیاست دانوں، مدبروں اور مورخوں کو اپنی جانب متوجہ رکھا ہے۔ ”عالم میں انتخاب“ اسی شہر دہلی کے آثار قدیمہ پر سرسید احمد خاں نے کتاب ”آثارالصنادید“ لکھی۔ انھوں نے اس کتاب میں دہلی کی عملداریوں کے مختصر حالات، قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے، بادشاہوں اور امیروں کی تعمیرات، دہلی اور دہلی کے عوام و خواص کی تفصیلات، خصوصاً شہر شاہ جہان آباد کے بارے میں بہت سی محققانہ معلومات فراہم کی ہیں۔

”آثارالصنادید“ تحریر کرنے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے متعدد ماہرین سرسیدیات نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں ان میں سے چند کا تذکرہ کر دینا خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔

کر سچین ڈیوٹرول نے لکھا ہے:

Sprenger later claimed that the book was compiled at his suggestion.⁽¹⁾

فاطمہ قریشی نے لکھا ہے:

He was an ambitious man and wanted to capture the attention of the British.⁽²⁾

مولانا الطاف حسین حالی نے وجہ تصنیف کچھ اس طرح بیان کی ہے:

اس زمانے میں جب کہ وہ (یعنی سرسید) دلی میں منصف تھے ان کو عماراتِ شہر اور نواحِ شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔۔۔ ”سیدالانبار“ جو اُن کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عماراتِ دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔^(۳)

ایک رائے یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ تھامس تھیوفیلس مٹکاف (۱۸۵۳ء-۱۷۹۵ء) سے سرسید کو تحریک ملی۔ مٹکاف کافی عرصے تک دہلی میں قیام پذیر رہے اور ان کے کہنے پر مرزا سنگین بیگ نے دہلی کی عمارتوں اور آثارِ قدیمہ پر ”سیرالمنازل“ تحریر کی تھی۔ مٹکاف کو خود بھی تاریخی عمارات اور آثارِ قدیمہ سے دل چسپی تھی اور اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک البم ”شاہی دہلی کی یادگاریں“ کے عنوان سے تیار کرایا تھا جو بعد میں ”دہلی البم“ کے نام سے مشہور ہوا اس میں مغل کورٹ کے مشہور آرٹسٹ مظہر علی خاں کے ذریعے دہلی کی تاریخی عمارتوں کی تصویریں بنوا کر جمع کی گئی تھیں یہ البم برٹش میوزیم میں آج بھی محفوظ ہے۔ سرسید کی تھامس مٹکاف سے شناسائی تھی لہذا سرسید نے آثارِ الصنادید کی پہلی اشاعت کو ان کے نام سے معنون کیا ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مٹکاف کے ایما پر ہی سرسید نے آثارِ الصنادید کو لکھنے کا ارادہ کیا۔

سی ایم نعیم (شکاگو یونیورسٹی) نے رائے پیش کی ہے^(۴) کہ سرسید جب فتح پور سیکری میں قیام پذیر تھے تو وہاں کے آثارِ قدیمہ کو دیکھ کر انھیں ”آثارِ الصنادید“ لکھنے کا خیال آیا۔ وہ ڈیوڈ لیلی ویلڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرسید نے آگرہ میں آٹھ سالہ قیام کے دوران آثارِ قدیمہ سے متعلق دو کتابوں (غالباً قلمی نسخوں) کا مطالعہ کیا تھا یا کم از کم دیکھی ضرورت تھی۔ کیا یہ کتابیں سرسید کے لیے اس مقصد کا محرک ثابت ہوئیں؟ آگرہ اور فتح پور سیکری کے قیام کے دوران سرسید کی ملاقات باہر سے آنے والے افسران سے ہوتی تھی۔ بہت سے غیر ملکی سیاح بھی ان سے ملتے رہتے تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ باہر سے آنے والے افسران اور غیر ملکی سیاح سرسید سے آثارِ قدیمہ کے تعلق سے معلومات فراہم کرنے کی گزارش کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے انھیں آثارِ قدیمہ سے دل چسپی پیدا ہوئی۔ فتح پور سیکری کے دوران قیام سرسید

کو ایسا ماحول مل گیا جس نے انہیں ماضی سے رشتہ استوار کرنے اور ماضی کے تسلسل میں حال کے ساتھ مستقبل پر غور و فکر کرنے کی طرف مائل کیا۔

سی ایم نعیم نے اپنے مقالے میں ایک دل چسپ انکشاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

The matter is complicated by the fact that Asar-I Recieved a favourable notice in the April 1847, Issue of the *Qiran-al-Sadain* the occasional journal of the Delhi College. The Unnamed author⁽⁵⁾ was most likely Dr Aloyys sprenger, the college's principal and journal supervisor who, else where claimed to have inspired syed Ahmad to write the book.⁽⁶⁾

کرسچین ڈبلیو ٹرول اور سی ایم نعیم کے ذریعے کیے گئے انکشافات سے یہ نکتہ پہلی بار سامنے آیا ہے کہ دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر نے سرسید کو ”آثار الصنادید“ لکھنے کی طرف مائل کیا۔ اس نکتے کے تعلق سے وضاحت پیش نہیں کی گئی ہے اس لیے یہ نکتہ ابھی تحقیق طلب ہے۔

سرسید احمد خاں نے از خود ”آثار الصنادید“ کے پہلے ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں وجہ تصنیف کچھ اس انداز میں بیان کی ہے:

مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانہ پر بہانہ سے اند کے نجات حاصل ہو جاوے اور فلک ناتواں کے پنجے سے کچھ مہلت ہاتھ آوے تو ایک ایسا نسخہ عجیب اور مجموعہ غریب خامہ چابک رقم کی مدد اور فکر آسمان پر کی اعانت سے لکھا جائے کہ عمارات سواد حضرت شاہجہاں ... اور مکانات درون شہر اور قلعہ مبارک کا حال اس میں مندرج ہو۔^(۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کافی عرصے سے ”آثار الصنادید“ لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اگرہے، فتح پور سیکری سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ان کی یہ دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

حالی نے ”حیات جاوید“ میں سرسید کے بھائی کے انتقال، محدود آمدنی اور کنبے کے اخراجات کے سبب مقروض ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ کوئی ایسی راہ تلاش کر رہے تھے جس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ حالی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ سرسید نے ”آثار الصنادید“ کو مالی فائدہ کی خاطر تحریر کیا تھا۔^(۸) یہ صحیح ہے کہ اپنی کشادہ دلی اور محدود آمدنی کے سبب سرسید مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے۔ لیکن وہ باخبر اور جہاں دیدہ انسان تھے اور اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ان کے دور میں اردو کتابوں کی اشاعت پر ناشرانہی نہیں دیتے تھے اس لیے یہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ وہ آثار الصنادید کی اشاعت سے مالی فائدہ کی توقع رکھتے ہوں گے۔ سی ایم نعیم نے اس طرف واضح

اشارہ بھی کیا ہے کہ:

Urdu publishers in 1847 did not pay royalties in fact authors often had to buy several copies themselves in order to get a book published, at best the author recieved one complimentary copy of the book by right.⁽⁹⁾

یہاں قابل غور بات یہ بھی ہے کہ سرسید کی اس سے قبل مقابلہ جاتی امتحانات کے تعلق سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کو فروخت کر کے ناشر نے خود تو خوب رقم جمع کی لیکن سرسید کو اس سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس تجربے کے علاوہ مرزا غالب کے دیوان کی مثال بھی سامنے تھی کہ:

Ghalib earned not one paisa from the sale of his book; most of time he had to buy some copies to satisfy the publisher's demand.⁽¹⁰⁾

مالی منفعت کے سلسلے میں حالی کا بیان اور گمان حقیقت سے کتنا دور ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل شواہد کی روشنی میں آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ”آثار الصنادید“ کی پہلی اشاعت کا دور وہ تھا جب پبلشر ادیبوں اور شاعروں کا بہت استحصال کر رہے تھے۔ وہ شاعروں اور ادیبوں کو یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی کتاب کی کتنی کاپیاں چھاپی گئیں اور کتنی فروخت ہوئیں۔ سرسید نے ۲۱ ستمبر ۱۸۴۶ء کو پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے لیے عبدالغفور نام کے شخص سے معاہدہ کیا تھا لیکن اس نے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں مذکورہ بالا اطلاعات فراہم نہیں کیں۔ مایوس ہو کر سرسید نے جب دوسرا ایڈیشن شائع کرایا تو اس کے سرورق پر یہ جملہ بھی شائع کرایا کہ:

جس کتاب پر مصنف کی مہر نہ ہو وہ کتاب چوری کی ہے۔⁽¹¹⁾

بہر کیف ”آثار الصنادید“ کی اشاعت سے سرسید کو مالی فائدہ تو نہیں ہوا البتہ اس نے ان کی شہرت میں چار چاند ضرور لگا دیے۔ اس کے سبب ہی انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ کی فیلوشپ سے نوازا گیا نیز اہالیان مغرب کی نگاہ میں ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا اور ان کی شناخت عالمی سطح پر قائم ہوئی۔ یہی نہیں مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔⁽¹²⁾

سرسید نے ”آثار الصنادید“ کے پہلے ایڈیشن میں انگریز حکمرانوں خصوصاً مٹکاف کی شان میں قصیدہ خوانی کی ہے۔ مٹکاف کی شان میں نہ صرف یہ کہ ایک مثنوی شامل کی گئی ہے بلکہ کتاب کو مٹکاف کے نام معنون کرتے ہوئے جن الفاظ اور القاب و آداب و احترام کا اہتمام کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کا ایک اہم مقصد انگریز حکمرانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا تھا۔ فاطمہ قریشی کے محولہ بالا بیان سے اس خیال کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں اس

کو مکرر نقل کیا جاتا ہے:

He was an ambitious man and wanted to capture the attention of the British.

”آثارالصنادید“ کے تعلق سے ایک دل چسپ سوال یہ بھی قائم کیا گیا ہے کہ اس کتاب کا اصل مصنف کون ہے؟ یہ سوال شاید کبھی قائم نہ ہوتا اگر ”حیات جاوید“ میں حالی نے سرسید کے اس اقرار کی اطلاع نہ دی ہوتی کہ کتاب کا کچھ حصہ ان کے دوست امام بخش صہبائی کا تحریر کردہ ہے:

”آثارالصنادید“ کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں کچھ اور تکلف پایا جاتا ہے، وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔^(۱۳)

”دلی کالج میگزین“ (۱۹۵۳ء) میں جاوید وششٹ نے اپنے مضمون ”مولانا امام بخش صہبائی قدیم دلی کالج کا ایک شہید“ میں سرسید کی امام بخش صہبائی سے مدد لینے کا ذکر کیا ہے:

سرسید احمد خاں نے آثارالصنادید کی ترتیب میں آپ سے کافی مدد لی جس کا اعتراف بھی کیا ہے۔^(۱۴)

امام بخش صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے استاد تھے اور سرسید کے دوست بھی تھے۔ ان کے بارے میں دلی کے علمی حلقوں میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ گھوسٹ رائٹر ہیں اور قادر بخش صابر سے منسوب کی جانے والی کتاب ”گلستانِ سخن“ درحقیقت امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے ”مخزنہ جاوید“ کی تقریظ میں ”گلستانِ سخن“ کو حضرت صہبائی کی تصنیف لکھا ہے۔^(۱۵) نسخ، غالب اور لالہ سری رام نے بھی گلستانِ سخن کو امام بخش صہبائی کی ہی تصنیف قرار دیا ہے۔^(۱۶) اسی ایم نعیم نے امام بخش صہبائی پر تحریر کردہ مضمون^(۱۷) میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ”آثارالصنادید“ تو سرسید نے ہی تحریر کی ہے لیکن یہ کام امام بخش صہبائی کی مدد کے بغیر محض ۱۸ مہینے کی مدت میں مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ فاطمہ قریشی نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔

سہ ماہی ”فکر و نظر“ علی گڑھ کے ”سرسید نمبر“ مارچ ۲۰۱۷ء میں پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کا مضمون ”سرسید کا تاریخی شعور“ شائع ہوا ہے (ص ۲۶۱) اس میں وہ لکھتے ہیں:

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ”آثارالصنادید“ ہندوستان کے کسی شہر سے متعلق لکھی جانے والی پہلی مقامی تاریخ ہے جو محققین کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

محض اردو زبان کی حد تک پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کی رائے کو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسری زبانوں مثلاً فارسی اور انگریزی زبانوں میں ۱۸۴۷ء سے قبل کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ ماہرین کے درمیان اس بات

پراختلاف ہے کہ سرسید نے ان سے استفادہ کیا یا نہیں؟ سرسید نے چوں کہ ان کتابوں سے استفادہ کرنے کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان کے حوالے پیش کیے ہیں اس لیے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کے مطالعہ میں یہ کتابیں نہیں رہی ہوں گی۔ آخر یہ کون سی کتابیں ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہوگا۔

بنگال کے قدیم دارالحکومت ”گوڑ“ پر شیاما پرشاد نے ۱۸۱۰ء میں ایک کتاب تحریر کی تھی جس کا نام ”قلعہ گوڑ“ رکھا گیا تھا۔ یہ کتاب میجر ولیم فرینکلن کے ایما پر لکھی گئی تھی۔ راج شاہی میں سلطان شجاع الدین کی تعمیر کردہ عمارتوں، مساجد اور دیگر عبادت گاہوں کا تذکرہ ”قلعہ گوڑ“ میں شامل کیا گیا ہے۔

آگرہ کے کلکٹر اور آگرہ کالج کے سپرنٹنڈنٹ جیمس اسٹیفن نے کالج کے طلبہ کو ہدایت کی کہ وہ آگرہ کی عمارتوں پر مقالے تحریر کریں۔ لہذا شیل چند نے ”تفریح العمارات“ اور مانک چند نے ”احوال شہر اکبر آباد“ عنوانات سے کتابیں لکھیں غالباً یہ وہی کتابیں ہیں جن سے سرسید نے آگرہ کے قیام کے دوران واقفیت حاصل کی تھی۔^(۱۸)

فاطمہ قریشی نے اپنے مقالے^(۱۹) میں رام راز (۱۸۳۴-۱۷۹۰ء) کی کتاب *Essay on the Architecture of the Hindus* کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں رام راز نے بنیادی مآخذ سے بہت مدد لی۔ جس سے کتاب کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا اور سرسید کی طرح رام راز کو بھی اس کتاب کی تالیف پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی رکنیت حاصل ہوئی تھی۔ رام راز بنگلور میں قیام پذیر تھے انھوں نے اپنی کتاب میں ہندو فن تعمیر کا تذکرہ پرزور طریقے پر کیا ہے۔ ان کا عام طور پر کہیں ذکر نہیں ملتا البتہ پرمود چندر کی کتاب *Text on the study of Indian Art* جو ہارورڈ یونیورسٹی پریس سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی تھی صرف اس میں رام راز کا تذکرہ شامل ہے۔

زین العابدین شروانی کی کتاب ”بوستان السیاحت“، مولوی عبدالقادر رامپوری کی کتاب ”وقائع عبدالقادر خانی“ اور مرزا سنگین بیگ کی ”سیر المنازل“ ایسی کتابیں ہیں جن کے اثرات شعوری یا غیر شعوری طور پر سرسید کی ”آثار الصنادید“ میں نظر آتے ہیں۔ ایک اور کتاب ”عمارات دہلی“ کا ذکر ارشد علی نے اپنی کتاب میں کیا ہے جو رام جی داس نے لکھی ہے۔^(۲۰) ارشد علی نے لکھا ہے کہ رام جی داس نے سرسید کے پہلے ایڈیشن سے نقل کی اور اس میں چند اضافے کیے جو معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں سرسید نے دوسرے ایڈیشن میں استعمال کر لیے۔

زین العابدین شروانی کی کتاب ”بوستان السیاحت“ (Garden of Voyaging) ۳۴-۱۸۳۳ء میں شیراز میں اس وقت مکمل ہوئی جب کہ مصنف کی عمر ۵۴ سال ہو چکی تھی۔ شروانی ۱۸۱۴ء میں دہلی آیا تھا۔ اس نے ہندوستان میں آٹھ سال تک قیام کیا۔ اس دوران وہ جن ۴۰ شہروں میں گیا ان کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ دہلی کے علاوہ اس کتاب میں لکھنؤ، لاہور، ملتان، فیض آباد، عظیم آباد، کلکتہ، کراچی وغیرہ کا ذکر شامل ہے۔ اس نے دس ماہ دہلی اور ۱۸ ماہ

کشمیر میں قیام کیا تھا۔ کتاب لکھنے کا آغاز اس نے ۱۸۳۱ء میں کیا تھا۔ شروانی نے ان شہروں کے تعلق سے جو معلومات فراہم کی ہیں، اس میں مقام کا بیان اس زمین کی اصل حالت، آب و ہوا، عوام اور ان کی خوش حالی، شہر کا محل وقوع وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز دواہم شخصیات بادشاہ شاہ عالم ثانی اور مشہور حکیم شریف خان سے شروانی کی ملاقات کا تذکرہ بھی شامل ہے۔^(۲۱)

مولوی عبدالقادر رامپور کے نامور عالم تھے اور برطانوی حکومت کی انتظامیہ میں اہم عہدوں پر فائز رہ چکے تھے ان کی ایک درجن کتابوں میں خودنوشت سوانح ”وقائع عبدالقادر خانی“،^(۲۲) امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔ فارسی میں تحریر کردہ اس کتاب میں دہلی کی عمارتوں کے احوال اور تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ عبدالقادر نے دہلی کی تاریخ کی تفصیل مہابھارت اور راج ترنگنی کے حوالے سے پیش کی ہے۔ انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں طبقات کے حکمرانوں کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے دہلی کے بادشاہوں کی فہرست یوڈھیشٹر سے شاہ عالم تک تیار کی تھی جو بد قسمتی سے شائع نہیں ہو سکی۔ بعد میں سرسید کی اسی طرز کی کتاب ”جام جم“ ۱۸ سال بعد شائع ہوئی۔ اسی میں لال قلعہ، قطب مینار، کوئلہ، جامع مسجد، دو مساجد، دو مدرسے، ۱۵ صوفی سنتوں اور عالموں کی قبروں، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ، جنت منتر، حوض شمسی، لوہے کا کھمبا، نظام الدین پر باؤلی وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ قطب مینار کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ یہ ہاپوڑ (یوپی) سے دکھائی دیتا ہے اور جمنائے کنارے ہے۔^(۲۳)

مولوی عبدالقادر نے ہندو Myth اور Legends کے بارے میں بھی کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ رائے چتھورا کے برہمنوں کے اس بیان پر یقین کرتے نظر آتے ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ زمین ایک سانپ کے پھن پر ٹکی ہوئی ہے۔ اسی لیے ان کا خیال ہے کہ قطب کی لاٹ کو گہرائی تک نصب کیا گیا ہے۔^(۲۴)

مرزا سنگین بیگ نے مٹکاف کی ایما پر ۱۸۱۸ء میں ”سیر المنازل“ لکھنا شروع کی اور ۱۸۲۱ء میں اسے مکمل کر لیا۔ سنگین بیگ مٹکاف کا ملازم تھا۔ غالباً مٹکاف کے تعاون سے یہ کتاب ۱۸۲۷ء میں شائع ہوئی۔ سنگین بیگ نے پہلے ایک کاپی تیار کر کے اسے مٹکاف کے نام معنون کیا۔ مرزا محمود خاں بہادر کی رفاقت سنگین بیگ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ مرزا محمود کی یادداشت بہت اچھی تھی اور وہ تاریخ کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اسی سبب سے تاریخی معلومات حاصل کرنے کے لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ فارسی میں لکھی گئی اس کتاب سے سرسید واقف تھے یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی قوی دلیل نہیں ملتی۔ ”سیر المنازل“ اور ”آثار الصنادید“ میں بعض مقامات پر متن میں مماثلت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ سرسید نے ”سیر المنازل“ سے استفادہ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ”آثار الصنادید“ اور مذکورہ بالا کتابوں کے مشتملات اور متن میں مماثلت نظر آتی ہے لیکن آثار الصنادید میں سرسید کا واضح نقطہ نظریہ ہے کہ اس

پر کسی اور کے اثرات نہیں ہیں۔ البتہ یہ سوال ضرور پریشان کرتا ہے کہ سرسید مظکاف سے قربت رکھتے تھے تو کیا انھوں نے ”سیر المنازل“ کا تذکرہ ان سے نہ کیا ہوگا؟ واضح ہو کہ یہ وہی مظکاف ہیں جنھوں نے سرسید کی بڑی خواہش ہونے کے باوجود انھیں دہلی آرکیولوجی سوسائٹی کا، جس کے وہ صدر تھے، رکن نہیں بنایا تھا۔ سرسید ۱۸۵۲ء میں رابرٹس کی وجہ سے اس سوسائٹی کے رکن نامزد ہوئے تھے۔^(۲۵) لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ سرسید اور مظکاف کے درمیان رشتے زیادہ مضبوط نہیں رہے تھے۔

فاطمہ قریشی نے اس بحث کو نئی سمت دینے کی پھر کوشش کی ہے کہ سرسید نے آثارالصنادید کس طبقے کے لیے تحریر کی۔ کیا سرسید کے نزدیک برطانوی حکومت کو خوش کرنا مقصود تھا یا وہ ہندوستانیوں کو ان کے شاندار ماضی کی جھلکیاں دکھا کر انھیں حوصلہ عطا کرنا چاہتے تھے۔ فاطمہ قریشی نے لکھا ہے:

The *Asar* is a basic reference text meant for the edification of a wide audience. The use of a vernacular language to write the text is a clear indicator of this outreach by Sir Syed. Urdu was not a language to reach any elite audience, It was a thoroughly middle class language in the nineteenth century and writing a book in Urdu meant the book was intended for the class.⁽²⁶⁾

فاطمہ قریشی کی اس رائے سے اتفاق یا اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد برطانوی حکمرانوں تک اردو کی رسائی ہو رہی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ سرسید نے اسی کے مد نظر کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا ہو۔ حالاں کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سرسید نے اپنی انگریزی کی محدود صلاحیت کی وجہ سے اردو زبان میں اس کتاب کو تحریر کرنا پسند کیا ہو۔

ماہرین سرسید کے درمیان آثارالصنادید کے سنہ اشاعت پر بھی بحث ہوتی رہی ہے۔ آثارالصنادید کا پہلا ایڈیشن کب اور کہاں سے شائع ہوا؟ ”آثارالصنادید“ کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں مطبع سیدالانبار دہلی سے شائع ہوا جو کہ ۶۶۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ رائل ایشیائٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ اور کورٹ آف ڈائریکٹرز لندن کے رکن کرنل سکسن کے مطالبے کے مد نظر جب سرسید اور مسٹر رابرٹس نے کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا تو اس وقت سرسید کو خیال آیا کہ ایک نیا ایڈیشن شائع کیا جائے جس میں ضروری ترمیم و اضافے کیے جائیں۔ لہذا ۱۸۵۴ء میں دوسرا ایڈیشن مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوا جو محض ۲۸۴ صفحات پر مشتمل تھا۔

سرسید نے ”آثارالصنادید“ کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۶ء عیسوی کے میں ایک کتاب ضلع دہلی کے مکانات کے حال

میں لکھ کر چھاپی تھی۔^(۲۷)

واضح رہے کہ سرسید نے یہاں ۱۸۴۶ء میں نے کتاب کے لکھ کر چھاپنے کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا سال اشاعت ۱۸۴۶ء ہے لیکن جو پہلا ایڈیشن شائع ہوا، اس کے سرورق پر سنہ ۱۸۴۷ء درج ہے۔ کیا سرسید سے ہجری ۱۲۶۳ کو عیسوی میں تبدیل کرنے میں سہو ہوا ہے۔ حیات جاوید میں حالی نے دواہم باتیں لکھی ہیں جو کہ غلط معلوم ہوتی ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

سرسید نے دوسرے ایڈیشن کے لیے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور وہ سب نقشے تلف ہو گئے۔
کچھ نقشے جواب ملے ہیں وہ محمدن اینگلو اور نیٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔^(۲۸)

حالی کا یہ لکھنا کہ غدر کی وجہ سے نقشے تلف ہو گئے، درست نہیں ہے کیوں کہ ”آثار الصنادید“ کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۴ء شائع ہو چکا تھا جب کہ غدر ۱۸۵۷ء میں پیش آیا۔ اس اشاعت کی توثیق حسب ذیل امور سے بھی ہوتی ہے:

- (۱) دوسری اشاعت کا دیباچہ اور ٹائٹل پیج مطبع سلطانی، دہلی سے ۱۸۵۴ء میں چھپا تھا۔
- (۲) تمام کتبے، ضمیمے اور تین باب مطبع احمدی، دہلی سے ۱۸۵۳ء میں ہی چھپ چکے تھے۔^(۲۹)
- (۳) سرسید نے ایک مضمون جنوری ۱۸۵۳ء میں آرکیولوجیکل سوسائٹی، دہلی کے جلسے میں پڑھا تھا جس کا عنوان *A Brief account of the minarats with stands at Kutub* تھا۔^(۳۰) کسی ڈبلیو ٹرول نے لکھا ہے کہ اس مضمون کو اختصار کے ساتھ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون انڈین اسٹینڈرڈ پریس، دہلی میں چھپا تھا۔ یہاں یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے طبع دوم مرتب کرنے کا ارادہ کرل سکسن، اے اے رابرٹس اور ایڈورڈ تھامس کے ایما پر کیا تھا۔
- قارئین کی دل چسپی کے مدنظر ”آثار الصنادید“ کے اشاعت پذیر اردو، انگریزی اور فرانسیسی (ترجمہ) ایڈیشن کی فہرست یہاں پیش کی جا رہی ہے:

(i) اردو ایڈیشن:

نمبر شمار	مطبع	مرتب	سال اشاعت
۱۔	مطبع سید الاخبار، دہلی	سرسید احمد خاں	۱۸۴۷ء
۲۔	مطبع سلطانی، دہلی	سرسید احمد خاں	۱۸۵۴ء
۳۔	مطبع نول کشور، لکھنؤ	اشاعت اول کا عکس	۱۸۷۶ء

- ۴۔ مطبع نول کشور اشاعت اول کا عکس ۱۹۰۰ء
- ۵۔ مطبع نامی پریس، کانپور منشی احمد اللہ رعد ۱۹۰۴ء
- ۶۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ڈاکٹر معین الحق ۱۹۶۶ء
- ۷۔ دہلی اردو اکادمی، دہلی ڈاکٹر خلیق انجم ۱۹۹۰ء
- ۸۔ سینٹرل بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی خالد نصیر ہاشمی ۱۹۹۵ء
- ۹۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ڈاکٹر خلیق انجم ۲۰۰۳ء
- ۱۰۔ سرسید اکیڈمی، علی گڑھ (عکس ۱۸۴۷ء) ڈاکٹر اصغر عباس ۲۰۰۷ء
- ۱۱۔ ایضاً، (عکس، ۱۸۵۴) ڈاکٹر اصغر عباس ۲۰۰۷ء
- ۱۲۔ علیشاہی پبلی کیشن، پرائیویٹ لمیٹڈ، علی گڑھ ڈاکٹر حسیم محمد ۲۰۱۷ء
- ۱۳۔ پبلی کیشن ڈویژن اے ایم یو، علی گڑھ ڈاکٹر محمد ظفر منہاج ۲۰۱۷ء

(ii) انگریزی ایڈیشن

1. *Monuments of Delhi -Historical Study* by R. Nath, Ambika Publisher's New Delhi (1979)
2. *Asar-us-Sanadid*, Edited and Translated by Rana Safvi, Tulika Books, Delhi (2018)

(iii) فرانسیسی ایڈیشن:

1. *Descriptions des monuments de Delhi en 1852, d'après le texte Hindustani de Saiyid Ahmad Khan*, by Garcin de Tasse, *Journal Asiatique*, Aug-Sept. 1860, Vol-15, 16.

”آثار الصنادید“ کا طبع اول تاریخی اولیت اور مکمل ایک جا اشاعت کے سبب اہمیت رکھتا ہے لیکن طبع دوم چوں کہ اول میں حذف و اضافہ کے بعد مرتب کیا گیا اس لیے آثار الصنادید کے معروضی مطالعہ کے دوران اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلے کی اہم معلومات کا ذکر کرنا خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔

فہرست میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ سرسید نے دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں مطبع سلطانی سے شائع کیا تھا جو بعض تبدیلیوں اور حذف و اضافے کے بعد مکمل ہوا تھا۔ اس کا پشت کا صفحہ (Back Cover) انگریزی میں تھا۔ دیباچہ اور ایک مضمون انگریزی میں شامل کیے گئے تھے۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

”آثارالصنادید“، تاریخ پرانی اور نئی عمل داریوں کے بابت ضلع دہلی، تصنیف سید احمد

خاں منصف درجہ اول مقام شاہجہان آباد فی ۱۲۶۹ ہجری مطابق ۱۸۵۲ء عیسوی۔^(۳۱)

یہ عبارت مذکورہ بالا نکات کی تصدیق کا بین ثبوت ہے کہ کتاب ۱۸۵۲ء میں تیار ہو چکی تھی اور اس کی اشاعت مرحلہ وار ہوئی۔ ایلیٹ کے نام سرسید کے خط مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۴۷ء (سی ایم نعیم کی اطلاع کے مطابق یہ خط برٹش لائبریری میں موجود ہے) سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ آثارالصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی باب الگ الگ چھاپے گئے تھے۔ خط میں سرسید ایلیٹ سے دریافت کرتے ہیں کہ:

To let him know what sections of Asar-I he already had
(Nambar ajza i kitab-i-Asar al Sanadid) So that the rest of the
book could be sent to him.⁽³²⁾

اس اقتباس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ”آثارالصنادید“ کے باب دراصل الگ الگ شائع ہوئے تھے اور ایک ساتھ پوری کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ وار بھی شائع نہیں کیے گئے تھے۔ حالاں کہ ۱۸۴۷ء میں پہلی بار ایک ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔ سی ایم نعیم کے ذریعے ہی یہ اطلاع بھی فراہم ہوئی کہ سید رجب علی ارسلو جاں کے نام غالب کے خط میں کتاب کی تین جلدوں کا ذکر ہے۔ ممکن ہے غالب نے تین الگ الگ باب کا ہی ذکر کیا ہو۔

سرسید احمد خاں نے پہلے ایڈیشن میں مٹکاف کا ذکر آداب والقباب کے ساتھ تو کیا ہی تھا اس کے علاوہ ان کی شان میں ایک مثنوی بھی شامل کی تھی۔ حیرت انگیز طور پر دوسرے ایڈیشن میں مٹکاف کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مٹکاف کا انتقال ۱۸۵۳ء میں ہو گیا تھا؟ سرسید نے دوسرے ایڈیشن میں ادب واحترام کے ساتھ تین انگریز افسران کا شکریہ ادا کیا ہے۔ وہ دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

میں کمال شکر ادا کرتا ہوں اور نہایت احسان مند ہوں جناب علی کرنیل سکسن صاحب
بہادر دام اقبالہ اور جناب مسٹر۔۔۔ تھراسٹن رابرٹس صاحب بہادر دام اقبالہ کا کہ یہ
کتاب ان دونوں صاحبوں کی قدردانی اور رئیس پروری سے تصنیف ہوئی جو ایک ذریعہ
ہے افتخار کا اور وسیلہ ہے یادگاری اس گمنام کا۔

اور میں نہایت شکر ادا کرتا ہوں جناب مسٹر ایڈورڈ تھامس صاحب بہادر دام اقبالہ
کا کہ یہ کتاب صرف صاحب ممدوح کی مدد اور اعانت اور عالی ہمتی اور قدردانی سے
چھاپہ ہوئی اور ہر شخص دور و نزدیک کے لیے اس کا فائدہ عام ہوا۔^(۳۳)

سرسید مٹکاف کی نظر عنایت کے متمنی تھے اور وہ شدید خواہش رکھتے تھے کہ انھیں آرکیولوجیکل سوسائٹی دہلی کی مکمل رکنیت حاصل ہو جائے۔ مٹکاف اس سوسائٹی کے صدر تھے۔ باوجود تمام کوششوں کے انھوں نے سرسید کو یہ رکنیت عطا نہیں کی حالانکہ سرسید نے ”آثار الصنادید“ جیسی کتاب کو ان کے نام معنون کیا تھا۔ یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ سرسید مٹکاف سے مایوس اور بددل ہو گئے تھے اور ان کی توقعات مسٹر رابرٹس سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ رابرٹس کے تعاون سے سرسید کو یہ رکنیت ۱۸۵۲ء میں حاصل ہو گئی۔ مٹکاف نے ”آثار الصنادید“ کے پہلے ایڈیشن پر کسی طرح کے اظہار خیال سے پرہیز کیا۔ وہ کون سی وجوہ تھیں جن کی وجہ سے مٹکاف نے ”آثار الصنادید“ کو نظر انداز کیا یہ ابھی تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ مٹکاف کی کمی کو الوئے اسپرنگر نے پورا کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے ”قرآن السعدین“ میں لکھا ہے:

This book is excellent and is of great importance to the society that has been founded at Delhi for the furtherance of researches into the old buildings of the past.⁽³⁴⁾

”آثار الصنادید“ کے مطالعے کے دوران مغلیہ حکومت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے بارے میں سرسید کے خیالات جاننے کی خواہش از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے بزرگ سرسید کے خاندان کے مربی رہے تھے۔ سرسید کی حیات میں بھی دربار سے ان کے والد کو تنخواہ دی جاتی تھی اور حکیم احسن اللہ خاں کے توسط سے سرسید کو بھی دربار سے خلعت و خطاب ملا تھا۔ ظاہر ہے آثار الصنادید کا قاری یہ گمان کر سکتا ہے کہ سرسید نے بھی شاہوں کی بخششوں کا اعتراف کیا ہوگا اور ان کے ذکر سے اپنی بزم کو سجایا ہوگا یہ بات خاصی توجہ طلب ہے کہ انھوں نے نہ صرف ان کے ذکر سے احتراز کیا بلکہ ان کو ہدف تنقید بھی بنایا۔ ڈیوڈ لیلی ویلڈ نے لکھا ہے کہ سرسید کا خیال تھا:

دلی کا معزول بادشاہ ایک چھریا مکھی کی شکل اختیار کر کے بیرون ملک جا کر دنیا بھر کی خبریں لایا کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس شخص کو ایک قسم کا مایخو لیا تھا اور وہ پاگل تھا۔⁽³⁵⁾

سرسید کے والد کو بہادر شاہ کے والد اکبر شاہ کی طرف سے ایک قطعہ زمین حاصل ہوا تھا وہ زمین والد کے انتقال کے بعد سرسید کو منتقل نہیں ہو سکی تھی۔ کہتے ہیں کہ سرسید اس وجہ سے بہادر شاہ ظفر سے شاکی تھے حالانکہ حکیم احسن اللہ خاں نے سرسید کے دل سے بادشاہ کے لیے ناراضگی کو ختم کرنے کی بہت کوششیں کیں۔

حکیم احسن اللہ خاں سے سرسید کے تعلقات بہت اچھے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے سرسید کو بادشاہ سے ان کے دادا والا خطاب ”جواد الدولہ“ دینے کی سفارش کی تھی۔ بادشاہ نے سرسید کو یہ خطاب ”عارف جنگ“ کے اضافے کے ساتھ عطا کیا تھا۔ مالی فائدے کے مد نظر سرسید کو حکیم احسن اللہ خاں نے بادشاہ ظفر کے خاندان کی تاریخ لکھنے کی تجویز رکھی تھی۔ جس پر سرسید کے کتاب لکھنے کی اطلاع اسماعیل پانی پتی نے (مقالات سرسید“ کی جلد ۱۶، ص ۷۳) فراہم کی ہے۔ یہ

تاریخ یا تو لکھی ہی نہیں گئی یا پھر شائع نہیں ہو سکی۔ شاید سرسید کو یہ تجویز پسند ہی نہیں آئی یا پھر بادشاہ سے اپنی ناراضگی کے سبب انھوں نے تاریخ لکھنے کا کام شروع ہی نہیں کیا۔ مرزا غالب نے بعد میں طویل عرصے کو محیط اسی طرح کی ایک کتاب حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز پر تحریر کی تھی۔ الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ سرسید نے بادشاہ کو آثار الصنادید میں بطور شاعر شامل نہیں کیا اور حدیہ کہ ان کے استاد محمد ابراہیم ذوق کو سترہ (۱۷) شاعروں میں سے ۱۶ ویں مقام پر کتاب میں شامل کیا جو ذوق کے شایان شان نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال سرسید بھی ایک بشر تھے اور انھوں نے بشری تقاضے کے مد نظر ایسا کیا تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

سرسید نے ”آثار الصنادید“ کے پہلے ایڈیشن میں کچھ عجیب و غریب باتیں بھی لکھی تھیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ لوگوں نے یہ تجربہ کئی بار کیا کہ وہ قطب مینار پر اوپر چڑھ جاتے تھے اور وہاں سے واپس لوٹتے ہوئے انھیں نیچے پہنچ کر ہی پتا چلتا تھا کہ بارش ہو چکی ہے۔ تب وہ سوچ کر حیران ہوتے تھے کہ مینار دراصل بادلوں سے اوپر ہے۔ اسے افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی کیوں کہ برسات والا بادل (جو کم سے کم اونچائی پر ہوتا ہے) بھی زمین سے تقریباً دو کلو میٹر کی اونچائی پر ہوتا ہے جب کہ قطب مینار کی اونچائی محض ۷۳ میٹر ہے ایسے میں یہ کیس ممکن ہے کہ بادل قطب مینار کی اونچائی سے نیچے ہو کر بارش کر گزرے؟

سرسید نے آثار الصنادید خواہ کسی بھی سبب کے تحت لکھی ہو یہ ضرور ہے کہ اس میں ایسی کشش ہے جس نے نہ صرف انھیں دنیا بھر میں شہرت دلائی بلکہ اس سے تاریخ و تحقیق کے نئے دروا ہوئے۔ سرسید نے جو ایک سائنٹفک خاکہ ترتیب دیا اس نے لوگوں کو ان کی اپنی تہذیب سے آگاہ کیا اور وہ اپنے بزرگوں کی عظمت سے واقف ہوئے۔

فاطمہ قریشی کی اس رائے کے ساتھ اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ:

Many books in this period fit in the genre of nostalgic remembrances of the former glory of India but Sir Sayyid's description seems to suggest the continued life of these buildings and there is no limit of melancholy in this writing. He is not working for a long gone era the book is much more strength forward recording of information about Delhi's architecture past and present.⁽³⁶⁾

مقالے میں جن حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کی روشنی میں از خود یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ آثار الصنادید درحقیقت سرسید کے ہی زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کے قریبی دوست امام بخش صہبائی کی مدد سرسید کو حاصل رہی۔ ڈیوڈ لیلی ویلڈ اور فاطمہ قریشی وغیرہ کی تحریروں کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سرسید

نے یہ کتاب مالی استعداد میں اضافہ کے مد نظر نہیں بلکہ برطانوی حکومت کے اعلیٰ حکام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر لکھی تھی۔ دہلی کی تاریخ اور یہاں کے آثار قدیمہ سے خاص دل چسپی رکھنے والے غیر ملکی سیاحوں کی مشکلات آسان کرنے کا خیال بھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ بیشک اب تک کی تحقیق کے مطابق سرسید کی یہ کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جاسکتی ہے حالانکہ اس سے قبل انگریزی اور فارسی وغیرہ زبانوں میں اس طرز و نوعیت کی کتابیں ۱۸۴۷ء سے قبل شائع ہو چکی تھیں۔ یہ الزامات قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتے کہ سرسید نے فارسی یا انگریزی کتابوں کو ماخذ کے طور پر استعمال تو کیا لیکن ان کے حوالے پیش نہیں کیے حالانکہ مرزا سنگین بیگ کی کتاب ”سیر المنازل“ کا ذکر ”آثار الصنادید“ میں نہ ملنا حیرت کا باعث ہے۔ بہر کیف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”آثار الصنادید“ ایک ایسی معرکہ آرا کتاب ثابت ہوئی جس نے نہ صرف یہ کہ نئی تحقیق کی راہ ہموار کی بلکہ سرسید کی شخصیت کو اس نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی مشہور دانشورانہ اور مصلحانہ عظمت کے اظہار سے قبل ہی عالمی سطح پر شہرت یافتہ بنا دیا تھا۔ سرسید کے مشن اور علی گڑھ تحریک کے فروغ میں اس کتاب کی وجہ سے تقویت ملنے کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی

- ۱۔ کرسٹین ڈیوکر سچین، (Christain W. Troll)، *A Note on an early topographical work of Sayyid Ahmad Khan: Asar al Sanadid*، مشمولہ ”جرنل آف دی رائل ایشیائی سوسائٹی“، ۱۹۷۲ء، رائل ایشیائی سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ، ص ۱۳۵
- ۲۔ فاطمہ قریشی، *Sir Sayyid Ahmad Khan's Asar ul Sanadid, The construction of History in Nineteenth Century India*، (اے بی پراؤن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص ۵۷
- ۳۔ الطاف حسین حالی، ”آثار الصنادید کا ذکر آب حیات سے“، مشمولہ ”آثار الصنادید“، سرسید احمد خاں، مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد، (کان پور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء)، ص ۵
- ۴۔ سی ایم نعیم، *Syed Ahmad and his Two books called "Asar al Sanadid"*، (کیسبرج یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ص ۸، آن لائن اشاعت، دیکھیے: doi:10.1017/S0026749X10000156
- ۵۔ غالباً یہ رام چندر ہیں اسپرنگر نہیں۔ کیوں کہ رام چندر ہی دہلی کالج سے نکل رہے رسالوں اور اخبارات ”فوائد الناظرین“ وغیرہ کو ایڈٹ کرتے تھے۔
- ۶۔ سی ایم نعیم، *Syed Ahmad and his Two books called "Asar al Sanadid"*، ص ۹
- ۷۔ سرسید احمد خاں، ”آثار الصنادید“، علی گڑھ: سرسید اکیڈمی، ۲۰۰۷ء (عکسی اشاعت، بکسٹو: منشی نول کشور، ۱۸۴۷ء)، ص ۵، باراؤل
- ۸۔ الطاف حسین حالی، ”حیات جاوید“، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰ء)، ص ۶۴
- ۹۔ سی ایم نعیم، *Syed Ahmad and his Two books called "Asar al Sanadid"*، ص ۱۰
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱



- ۱۱۔ سرسید احمد خاں، ”آثار الصنادید“، علی گڑھ: سرسید اکیڈمی، ۲۰۰۷ء (عکسی اشاعت، دہلی: مطبع سلطانی، واقع قلعہ معلیٰ، ۱۸۵۴ء)، سرورق، بار دوم
- ۱۲۔ گارسیس داتاسی، *Description des monuments de Delhi en 1852, d'après le texte Hindustani de Saiyid Ahmad Khan*، جرنل ایشیاٹک، پیرس، شمارہ ۱۵، ۱۶، اگست، ستمبر، ۱۸۶۰ء
- ۱۳۔ الطاف حسین حالی، ”حیات جاوید“، (دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء)، ص ۶۵۳
- ۱۴۔ قاضی عبدالودود، ”گلستان سخن“، مشمولہ ”دلی کالج اردو میگزین“، قدیم دلی کالج نمبر، شمارہ ۱۹۵۳، دہلی، ص ۷۷
- ۱۵۔ ایضاً
- ۱۶۔ ایضاً، ص ۹۹
- ۱۷۔ سی ایم نعیم، *Shaikh Imam Bakhsh Sahbai'i: Teacher, Scholar, Poet, Puzzle-Master*، مشمولہ *The Delhi College*، مرتبہ: مارگریٹ پرناؤ، (نئی دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۸۵-۱۳۵
- ۱۸۔ مرزا سنگین بیگ، ”سیر المنازل“، ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۱۴ء)، ص ج
- ۱۹۔ فاطمہ قریشی، *Sir Sayyid Ahmad Khan's Asar ul Sanadid, The construction of History in Nineteenth Century India*، ص ۵-۶
- ۲۰۔ ارشد علی، ”آثار الصنادید: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ“، (جہلم: پاکستان آواز عالم گیر ایجوکیشنل پبلشرز، ۱۹۹۸ء)
- ۲۱۔ زین العابدین شروانی، ”بوستان السیاحت“، (تہران: کتب خانہ ثنائی، ۱۸۹۷ء)، ص ۳۱۷-۳۱۸
- ۲۲۔ سی ایم نعیم نے اپنے مقالے میں اس کتاب کا تذکرہ ص ۱۶ پر کیا ہے۔
- ۲۳۔ سی ایم نعیم نے ص ۱۸ پر ذکر کیا ہے۔
- ۲۴۔ محمد ایوب قادری، مرتب، ”علم و عمل: وقائع عبدالقادر خانی“، ترجمہ: معین الدین افضل گڑھی، (کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۱ء)، ص ۱۹۶
- ۲۵۔ فاطمہ قریشی، *Sir Sayyid Ahmad Khan's Asar ul Sanadid, The construction of History in Nineteenth Century India*، ص ۵۸
- ۲۶۔ کرسٹین ڈبلیو کرسٹین، *A Note on an early topographical work of Sayyid Ahmad Khan: Asar al Sanadid*، (Christain W. Troll)، محولہ بالا، ص ۱۳۳
- ۲۷۔ سرسید احمد خاں، دیباچہ، ”آثار الصنادید“، (کانپور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء)، ص ۲
- ۲۸۔ ایضاً، بہ عنوان ”آثار الصنادید کا ذکر حیات جاوید میں“، ص ۷
- ۲۹۔ ڈاکٹر اصغر عباس، مرتب، ”آثار الصنادید“، (علی گڑھ: پیلی کیشن ڈویژن، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۵
- ۳۰۔ کرسٹین ڈبلیو کرسٹین، *A Note on an early topographical work of Sayyid Ahmad Khan: Asar al Sanadid*، (Christain W. Troll)، محولہ بالا، ص ۱۴۴-۱۴۳
- ۳۱۔ سرسید احمد خاں، ”آثار الصنادید“، عکس اشاعت دوم، محولہ بالا، سرورق
- ۳۲۔ سی ایم نعیم، *Syed Ahmad and his Two books called "Asar al Sanadid"*، ص ۹
- ۳۳۔ سرسید احمد خاں، ”آثار الصنادید“، (کانپور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء)، ص ۵-۴
- ۳۴۔ بحوالہ: کرسٹین ڈبلیو کرسٹین، *A Note on an early topographical work of Sayyid Ahmad Khan: Asar al Sanadid*، (Christain W. Troll)، محولہ بالا، ص ۱۴۳-۱۴۱
- ۳۵۔ ڈیوڈ لیلی ویلڈ، (David Lelyweld)، ”سید احمد خاں اور مغل“، ترجمہ: شمیم الزماں، مشمولہ ”فکر و نظر“، ”سرسید نمبر“، مارچ، ۲۰۱۷ء، ص ۷۷



۳۶۔ فاطمہ قریشی، *Sir Sayyid Ahmad Khan's Asar ul Sanadid, The construction of History in Nineteenth Century India*، جُولہ بالا، ص ۵۸

مآخذ

- ۱۔ بیگ، مرزا سنگین، ”سیر المنازل“، ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۱۴ء
- ۲۔ حالی، الطاف حسین، ”آثار الصنادید کا ذکر آب حیات سے“، ”آثار الصنادید“، سرسید احمد خاں، مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد، کان پور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء
- ۳۔ _____، ”حیات جاوید“، دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۹۰ء
- ۴۔ _____، دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء
- ۵۔ خاں، سرسید احمد، ”آثار الصنادید“، علی گڑھ: سرسید اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، عکسی اشاعت، لکھنؤ: بنشی نول کشور، ۱۸۴۷ء، باراؤل
- ۶۔ _____، علی گڑھ: سرسید اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، عکسی اشاعت، دہلی: مطبع سلطانی، واقع قلعہ معلیٰ، ۱۸۵۴ء، باردوم
- ۷۔ _____، دیباچہ، _____، کان پور: نامی پریس، ۱۹۰۴ء
- ۸۔ شروانی، زین العابدین، ”بوستان السیاحت“، (تہران: کتب خانہ ثنائی، ۱۸۹۷ء)، ص ۳۱۷-۳۱۸
- ۹۔ عباس، اصغر، ڈاکٹر، مرتب، ”آثار الصنادید“، علی گڑھ: پبلی کیشن ڈویژن، اے ایم یو، ۲۰۰۷ء
- ۱۰۔ علی، ارشد، ”آثار الصنادید: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ“، جہلم: پاکستان آواز عالم گیر ایجوکیشنل پبلشرز، ۱۹۹۸ء
- ۱۱۔ قادری، محمد ایوب، مرتب، ”علم و عمل: وقائع عبدالقادر خانی“، ترجمہ: معین الدین افضل گڑھی، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۱ء
- ۱۲۔ قریشی، فاطمہ، *Sir Sayyid Ahmad Khan's Asar ul Sanadid, The construction of History in Nineteenth Century India*، اے بی براؤن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء
- ۱۳۔ نعیم، سی ایم، ”Syed Ahmad and his Two books called 'Asar al Sanadid'“، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء
- ۱۴۔ _____، ”Shaikh Imam Bakhsh Sahbai'i: Teacher, Scholar, Poet, Puzzle-Master“، مشمولہ *The Delhi College*، مرتبہ: مارگریٹ پرناؤ، نئی دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء

رسائل و جرائد

- ۱۔ ”جرنل آف دی رائل ایشیائیٹک سوسائٹی“، اپریل ۱۹۷۲ء، رائل ایشیائیٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ
- ۲۔ ”جرنل ایشیائیٹک“، پیرس، شمارہ ۱۵، ۱۶، اگست، ستمبر، ۱۸۶۰ء
- ۳۔ ”ڈی کالج اردو میگزین“، دہلی، قدیم دلی کالج نمبر، شمارہ ۱۹۵۳ء
- ۴۔ ”فکر و نظر“، علی گڑھ، سرسید نمبر، مارچ، ۲۰۱۷ء

